جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

شاعرِ مشرق

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

"دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ہر شئے پر مقدم ہے، نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود معین کرنے کا نام اصطلاح میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی، قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا، مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں، دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہرحال، حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔[۸]"

(علامہ اقبالؒ)

ڈاکٹر محمد اقبال

ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا: محمد اقبال کی پیدائش 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئی۔ والدین نے شروع سے ہی تعلیم و تربیت کی طرف خاصہ دھیان دیا۔ چنانچہ یہ والدین کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ صبح جلد اٹھ کر دیر تک قرآن کی تلاوت کرنا بچپن سے اقبال کا معمول تھا۔ آپ کے والد نے کسی صبح قرآن پڑھتے وقت ہی ننھے اقبال کو نصیحت کی تھی کہ: بیٹا، جب تم قرآن کو پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ تم ہی پر اترا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے۔ ننھے اقبال نے اچھے بچوں کی طرح ابا کی اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا اور عمر بھر نہیں بھولے۔ اقبال وقت ضائع کرنے والے کھیلوں اور آوارہ گردی سے کوسوں دور رہتے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مکتب سے حاصل کی پھر سیالکوٹ ہی کے اسکاچ مشن اسکول اور کالج میں داخل ہوئے۔ بلا کے ذہین طالب علم تھے چنانچہ اسکولی زندگی میں ہی متعدد بار وظیفوں اور انعامی اسکالرشپ سے نوازے گئے۔ اسکولی تعلیم کے زمانے میں آپ سیالکوٹ کے مختلف مساجد و مکاتب میں علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر فارسی پڑھا کرتے تھے۔ اسکول ہی کے زمانے سے پختہ شعر کہنے لگے تھے۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے کے لیے لاہور آئے اور یہاں کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ 1897 میں بی اے امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔ انگریزی اور عربی، ان دو مضامین میں یونیورسٹی بھر میں اول آ کر دو طلائی تمغے حاصل کیے۔ بعد ازاں آپ نے فلسفہ کا مضمون اختیار کیا اور اسی کالج سے ایم اے کرنے لگے۔ 1899 میں ایم اے کے امتحان میں بھی یونیورسٹی ٹاپ کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔

بچپن ہی سے اشعار کہنے لگے تھے چنانچہ 1895 میں جب تعلیم کے سلسلے میں لاہور آئے تو دوستوں کے اصرار پر مختلف مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھنی شروع کی تھیں۔ ایک نوجوان شاعر کے ایسے منجھے

ہوئے اشعار سن کر اساطین نے اسی وقت اقبال کی بلند اقبالی کی پیشین گوئی کردی تھی۔ انجمن حمایت اسلام کے 1900 کے سالانہ جلسے میں اقبال نے اپنی نظم نالۂ یتیم پڑھی جس کا خوب چرچا ہوا۔ کئی سالوں تک انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں اقبال اپنا کلام تحت اللفظ اور پھر ہلکے ترنم سے پڑھتے رہے، ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی نظم سننے کے لیے ان جلسوں میں شائقین کی تعداد بسا اوقات دس دس ہزار سے تجاوز کر جاتی تھی اور سب ہمہ تن گوش ہو کر ان کا کلام سنتے تھے۔

ایم اے کرنے کے بعد اقبال اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لکچرر مقرر ہوئے۔ 1903 میں آپ کی علم الاقتصاد پر ایک کتاب شائع ہوئی۔ اسی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ لیکن ان ملازمتوں سے زیادہ آپ کو حصولِ علم کا شوق تھا چنانچہ ستمبر 1905 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہوگئے۔ یورپ میں آپ کا قیام تین سال رہا۔ اس مختصر مدت میں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے میٹافزکس آف پرشیا کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے پر کیمبرج یونیورسٹی سے آپ کو ایک امتیازی سرٹیفکیٹ سے بھی نوازا گیا۔ اس سفر میں تقریباً چھ ماہ آپ نے پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کے طور پر لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی خدمات انجام دیں۔ متعدد لیکچرس بھی دیے جن میں اسلام کے موضوع پر دیے گئے ان کے چھ خطبات قابل ذکر ہیں۔

بتا تیری رضا کیا ھے: روپیہ، شہرت، مناصب ہمیشہ اقبال کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہے اور اقبال زندگی بھر ان سب سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف سرپٹ دوڑتے رہے۔ لاہور میں جب اقبال کی شاعری کا نیا نیا چرچا ہوا تھا ان دنوں بھی انھیں متعدد رسائل و جرائد، اخبارات، مجلسوں اور تنظیموں سے فرمائشیں آنے لگی تھیں، لیکن اقبال نے زیادہ تر کا جواب انکار کی صورت میں ہی دیا۔ 1908 میں جب آپ یورپ سے ڈاکٹر اور بیرسٹر ایٹ لاء ہو کر لاہور لوٹے تو چیف کورٹ میں وکالت شروع کی۔ اسی دوران انھیں گورنمنٹ کالج لاہور کے صدر شعبۂ فلسفہ کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اقبال نے اپنی مصروفیت کا عذر پیش کیا۔ کالج کی طرف سے اصرار بڑھا، ادھر چیف کورٹ کے حکام بھی اقبال کو کسی صورت چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ چنانچہ محکمۂ تعلیم اور چیف کورٹ نے مل کر درمیانی راہ نکالی اور یہ طے پایا کہ صبح کا وقت اقبال کالج میں دیا کریں اور اس کے بعد عدالت میں آکر پریکٹس کریں۔

حکومت سے اس بات کی باقاعدہ اجازت لی گئی کہ اقبال کے مقدمے عدالت میں اسی وقت پیش ہوں گے جب کہ کالج کے بعد وہ عدالت میں آجائیں۔ کوئی ایک ڈیڑھ سال کالج میں پروفیسری کرنے کے بعد اقبال نے گورنمنٹ کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ ایسے اعلیٰ عہدے سے استعفیٰ صرف اس لیے دیا کہ وہ ملازمت کو ایک طرح کی پابندی سمجھتے تھے اور اپنے خیالات کی اشاعت میں انھیں ادنی سے ادنی قسم کی پابندی بھی گوارا نہیں تھی۔ جنوری 1923 میں علامہ اقبال کو انگریزوں نے 'سر' کے خطاب سے نوازا۔

خودی کا رازداں، خدا کا ترجماں: 1915 میں آپ کی فلسفیانہ مثنوی اسرار خودی (فارسی) شائع ہوئی۔ پھر 1918 میں اسی کا تتمہ رموز بیخودی منظر عام پر آئی۔ اقبال کی شاعری کوئی ہنسی، دل لگی یا کسی شوخ حسینہ کی زلفوں کے پیچ وخم کی اسیر نہیں ہے۔ یہ ایک باہمت شخص کی بامقصد شاعری ہے۔ اقبال نے شاعری سے پیغامبری کا کام لیا۔ خودی، اقبال کی شاعری کا ایک لازوال فلسفہ ہے۔ خودی سے ان کی مراد فخر، غرور وتکبر نہیں بلکہ وہ خود اعتمادی ہے جو خدا اعتمادی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ استقامت اور استقلال کا وہ فلسفہ ہے کہ جس کے بوتے پر ایک 'مشت خاک' انسان طوفانوں کے رخ پھیر سکتا ہے، چٹانوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ یقیناً اقبال کی شاعری میں عشق کو عقل پر یک گونہ فوقیت حاصل ہے، لیکن اقبال عشق کو اس کے مجازی نہیں بلکہ حقیقی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ عشق سے ان کی مراد مجنوں کا لیلیٰ سے عشق نہیں بلکہ ایک بندے کا اپنے خدا سے عشق ہے، ایک امتی کا اپنے پیمبر سے عشق ہے۔ وہ کئی اشعار میں تڑپ کر اس 'جنوں' کو یاد کرتے ہیں جس میں 'خرد' سے یہ کہنے کی ہمت تھی کہ تو اپنی غیر فعالیت کے لیے 'بہانے نہ تراش'۔ ان کی نظر میں زمانے نے جنوں کی اصلیت کو نہیں سمجھا، جنوں کی اصلیت یہ ہے کہ وہ خرد کی قبا ہے اور خرد ہی کو راست آتی ہے۔

1922 میں اقبال کا ایک مجموعۂ کلام **پیام مشرق** کے عنوان سے شائع ہوا۔ 1924 میں **بانگ درا** اقبال کے اردو کلام کے پہلے مجموعہ کے طور پر شائع ہوا۔ **زبور عجم** (1927)، **جاوید نامہ** (1933) اور **بال جبریل** (1935) کے ساتھ آپ بار بار اپنے دل کا درد بانٹتے رہے اور امت کے درد کی دوا میں مصروف رہے۔ کشمکش زندگی سے گریز آپ کے لیے شکست کے ہم معنی ہے۔ آپ موجودہ سائنس اور ترقیات کے مخالف نہیں ہیں لیکن اس راز کو جانتے ہیں کہ خودی میں جب جب انقلاب پیدا ہوا ہے تو اسکول و کالج یا محلات کے عیش و تنعم میں نہیں بلکہ دشت و بیاباں میں ہوا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پرسوز انداز میں اپنے آباء کی سادگی اور 'صحرا نشینی' کو یاد کرتے ہیں جو اقبال کے مطابق

کے مطابق ان کی کامرانی کی شاہ کلید تھی۔ وہ بار بار امت کے نوجوانوں کو 'زورِ حیدر'، 'فقرِ بوذر' اور 'صدقِ سلمانی' کی یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا نشیمن 'قصرِ سلطانی کے گنبد میں' نہیں بلکہ 'پہاڑوں کی چٹانوں پر' ہے۔

اقبال کی ضرب کلیم 1936 میں شائع ہوئی جس میں مغربی تہذیب وتمدن پر صرف شاعرانہ نہیں بلکہ فلسفیانہ انداز میں تیشے چلائے گئے ہیں، البتہ شعریت کا آہنگ کہیں متاثر نظر نہیں آتا دو چند ہی معلوم پڑتا ہے۔ اسی سال آپ کا ایک اور فارسی مجموعۂ کلام پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق شائع ہوا۔ اخیر میں 1938 میں ارمغانِ حجاز کی اشاعت ہوئی۔

آپ کی شاعری کی مقصدیت کا جو عالم ہے وہی عالم اس کی ادبیت کا ہے۔ شاید ہی اقبال کا کوئی شعر پند وموعظت سے خالی ہو اور شاید ہی ادب کا کوئی باذوق قاری اقبال کے کسی شعر کو محض وعظ کہہ کر رد کر سکے۔ آپ کے اشعار میں غضب کی آمد نظر آتی ہے۔ عینی شاہدین کا بیان ہے کہ جب طبیعت روانی پر ہوتی تھی تو ایک ساتھ کئی کئی اشعار کہتے چلے جاتے تھے اور بعد میں انھیں اسی ترتیب سے بغیر کسی ادنیٰ فرق کے کاغذ پر نقل کر لیتے تھے۔ خود اپنے بیان کے مطابق جب طبیعت زوروں پر ہو تو ایک رات میں تین تین سو اشعار تک کہے ہیں۔

اقبال کی شاعری کے جاہ وجلال اور زیر وبم کا ان کی زندگی کی سادگی سے موازنہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ انھیں کھانے کی فکر تھی نہ پہننے کی۔ دن میں اکثر ایک ہی وقت کے کھانے پر اکتفا کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا شہرہ سن کر ایک دھوبی ان کے گھر آیا اور ملازم سے پوچھا کہ اقبال کہاں ہیں۔ ملازم نے ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ سادی سی بنیان اور لنگی میں ملبوس اقبال صحن میں آرام فرما رہے تھے۔ دھوبی نے انھیں کوئی دوسرا ملازم سمجھتے ہوئے انہی سے سوال کیا: اقبال کہاں ہیں؟ دھوبی نے اس وقت دانتوں تلے انگلی دبالی جب اقبال نے مسکرا کر جواب دیا: ''میں ہی ہوں، آؤ بیٹھو''۔

اسلام سے آپ کا شغف صرف شاعری اور دوسروں کو نصیحت تک نہ تھا بلکہ اسلام کو وہ اپنے ذہن، قلب اور زندگی میں اتار چکے تھے۔ جوانی کے ایام سے ہی معمول تھا کہ صبح تین چار بجے اٹھ جاتے تھے اور فجر تک کا وقت قیام اللیل اور تلاوت قرآن میں لگاتے تھے۔ وہ اسلام کے جزئیات پر کمال انکساری اور کمال اعتماد سے عمل کرتے تھے چنانچہ اپنے سفر انگلستان کے دوران رفع حاجت کے لیے کمرے

سے لوٹا ساتھ لے کر نکلنا ان کا معمول تھا۔ بار ہا انھیں ایسا کرتے دیکھ ان کی میزبان (لینڈ لیڈی) نے اس کی بابت دریافت کیا۔ اقبال کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید جھینپ جاتا لیکن اقبال نے اسلامی آدابِ طہارت کی اس صفائی اور خود اعتمادی کے ساتھ تشریح کی کہ میزبان خاتون خود ان آداب پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو گئی۔

شاھین، سیاست کے گلیاروں میں: شروعات میں زمانے سے متاثر ہو کر اقبال کی شاعری سے وطن پرستی کی بو آتی تھی مگر یورپ میں 'قوم پرستی' کے نتائج اور جنگ عظیم اول کی تباہ کاریاں دیکھ کر وہ اس نظریے کی شیطنت کے قائل ہوئے اور اسلامی مساوات اور اخوت کا پیغام ساری انسانیت کے نام، الفاظ کے دانوں میں پرو کر پیش کیا۔

جہاں تک مزاج کا تعلق ہے، اقبال ایک صوفی منش اور تنہائی پسند طبیعت کے حامل تھے لیکن جب احباب کا اصرار بڑھا تو اقبال نے سیاست کے کوچے میں بھی قدم رکھا۔ اور یوں شاعرِ مشرق نے اپنے دیوان ہی میں نہیں بلکہ ایوان میں بھی حق کا راگ الاپا۔ 1926 میں لاہور کے حلقۂ انتخاب سے کونسل کی امیدواری کے لیے کھڑے ہوئے۔ کونسل کی ممبری کے لیے، تب بھی اور اب بھی، لوگ نہ جانے کتنا پاپڑ بیلتے ہیں، نہ جانے کتنا پیسہ بے دریغ لٹاتے ہیں۔ لیکن اقبال نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ خطاب بھی معدودے چند انتخابی جلسوں سے کیا اور اس میں بھی ووٹ مانگنے کے بدلے اصولی باتوں تک خود کو محدود رکھا۔ ان کی ساری انتخابی مہم ان کے احباب اور بہی خواہوں نے چلائی۔ اسے اقبال کا اخلاقی اثر ہی کہیے کہ جب ان کی نامزدگی کا اعلان ہوا تو دو منجھے ہوئے سیاست دانوں نے از خود اپنی امیدواری کے پرچے ان کے حق میں واپس لے لیے۔ اقبال ایک نمایاں فرق کے ساتھ کونسل میں منتخب ہو گئے۔

کونسل کی ممبری کے زمانے میں آپ نے گراں قدر قومی خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں ملک میں ایک فتنہ پرور طبقہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا تھا جو سنجیدہ مذہبی بحث کے بدلے سیدھے گالیوں پر اتر آتا تھا اور ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوتا تھا۔ اسی طرح فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوتے تھے۔ چنانچہ اقبال کی تحریک پر 1927 میں بانیانِ مذاہب کی توہین کرنے والوں کے خلاف ایک قانون پاس ہوا۔ کسانوں کو انصاف دلانے سے لے کر، دیہی علاقوں میں وبائی امراض کی روک تھام کے لیے اقدامات، ہر جگہ اقبال قوم کے مسیحا بن کر سامنے آئے۔ بعض دیگر ہندوستانی ممبرانِ کونسل

کے برخلاف آپ نے کونسل میں انگریزوں کی جی حضوری کرنے سے صاف انکار کردیا اور 'حق گوئی و بیباکی' کے 'آئینِ جواں مردی' پر عمل پیرا رہے۔ اقبال نے عقلی استدلال، تاریخ اور خود برطانوی فلسفیوں کے حوالے سے ملکیت عامہ کے استحصالی تصور کا ابطال کیا اور برطانوی حکومت کے اس نظریے کی شدومد سے تردید کی کہ ساری زمین حکومت کی ملکیت ہوتی ہے۔

سیاست کے میدان میں جب آپ آئے تو بہت جلد عوام وخواص کے درمیان ایک قبول عام حاصل کرلیا۔ دسمبر 1930 میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (الہ آباد) کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کو بحیثیت نظام حیات دنیا کے سامنے برت کر دکھادیں۔ لہذا اپنے صدارتی خطبے میں متحدہ ہندوستان میں ایک فیڈریشن کے تحت انھوں نے داخلی امور میں آزاد مسلم ریاستوں کا مطالبہ کیا۔ آگے چل کر اسی مطالبے کو توڑ مروڑ کر مسلم لیگ نے اس میں سے پاکستان کا نظریہ برآمد کرلیا جس سے اقبال مستثنیٰ ہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو عام معنوں میں کبھی 'قوم' نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ اس کی داعیانہ و مبلغانہ کردار کے قائل رہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کو 'صداقت'، 'عدالت' اور 'شجاعت' کا سبق پڑھاتے رہے تاکہ ان سے 'دنیا کی امامت' کا کام لیا جاسکے۔

1928 میں آپ نے مدراس میں چھ فلسفیانہ لیکچرس دیے جو بعدازاں Reconstruction of religious thought in Islam کے عنوان سے شائع ہوئے۔ مدراس کے اس سفر کے موقع سے آپ نے جنوبی ہند کے کئی اہم مقامات کا دورہ کیا اور تقریریں کیں۔ میسور، بنگلور، سرنگا پٹم اور پھر حیدرآباد گئے۔ 1931 اور 1932 میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یورپ گئے۔ یورپ کے ان اسفار کے دوران آپ متعدد مشہور شخصیات سے ملے۔ فرانسیسی فلسفی برگسان، اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی سے ملاقات کی۔ اسپین کا سفر خاصے چاؤ سے کیا، وہاں مسجد قرطبہ کی زیارت کی اور اس میں اذان دینے کی سعادت حاصل کی۔ 'علم کے موتی' اور اپنے آباء کی کتابیں دیکھ چکنے کے بعد اپنے سیپارہ دل کے ساتھ موتمر اسلامیہ میں شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے۔

1933 میں شاہ افغانستان کی دعوت پر مذہبی و تعلیمی امور پر مشورے دینے کے لیے دیگر علماء کے ساتھ ڈاکٹر اقبال بھی افغانستان روانہ ہوئے۔

1936 سے آپ کی صحت کافی بگڑ گئی، خوراک ایک تو پہلے ہی کم تھی اب بالکل برائے نام رہ گئی۔ اقبال

اس زمانے کے قائدین سے کافی مایوس تھے اور ان میں اشاروں کو سمجھنے والی 'فراست' اور 'خوئے دلنوازی' کی کمی کے شاکی تھے۔ انھیں جوانوں سے ہی محبت اور امیدیں تھیں کہ وہ 'ستاروں پر کمندیں' ڈالنے کی ان کی آرزوؤں کو بر لائیں گے۔ شاید اسی لیے انھوں نے 8-1937 میں نوجوان مفکر ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو پٹھانکوٹ آنے کی دعوت دی تھی تاکہ دونوں مل کر خالص اسلامی خطوط پر ایک چھوٹے سے **دار الاسلام** کا قیام کریں مگر افسوس کہ زندگی دغا دے گئی اور علامہ اقبال 21 اپریل 1938 کو اس دار فانی سے کوچ کر کے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

ضرب کلیم: اقبال کا زمانہ سیاسی و سماجی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کی 'صفیں کج'، 'دل پریشاں' اور 'سجدے بے ذوق' تھے۔ اقبال نے انھیں بتایا کہ ایسا اس لیے ہے کہ ان میں 'جذب اندروں' باقی نہیں ہے۔ انھوں نے محض قوم کے امراض کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ ایک ماہر حکیم کی طرح دوائیں بھی تجویز کیں۔ ان کے دور میں خلافت عثمانیہ کے زوال کا سانحہ ہوا تھا، اس سانحے پر بڑے بڑے مسلم لیڈران کا پتہ پانی ہو گیا تھا لیکن ان تمام مایوسیوں سے اوپر اٹھ کر وہ اقبال کی ہی آواز تھی جس نے قوم کو 'خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا' کا امید افزا پیغام دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مادی خوشحالی اور منصب اور نوکریوں کی دوڑ میں مسلمان بے تحاشہ بھاگے چلے جا رہے تھے، اقبال نے انھیں 'ستاروں سے آگے' کی سجھائی اور بتایا کہ ان کی منزل چرخِ نیل فام سے بھی پرے ہے؛ وہ اس زمین و آسماں کے لیے بنائے ہی نہیں گئے بلکہ یہ سارا جہاں ان کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب کی تقلید میں مسلمان اندھے ہوئے جا رہے تھے، اقبال نے سوٹ بوٹ پہن کر بھی ملت کو 'اسلاف کا قلب وجگر' ڈھونڈ لانے کے لیے للکارا۔ آپ نے مغربی تہذیب اور مغربی نظام کی قلعی کھول کر رکھ دی اور واشگاف انداز میں اعلان کیا کہ اس تہذیب کا چہرہ ضرور روشن ہے لیکن اندروں 'چنگیز سے تاریک تر' ہے۔ جمہوریت، جس کے اپنے اور غیر سبھی ثنا خواں تھے اس پر یہ اقبال کی ہی تنقید تھی کہ اس نظام کا انحصار کمیت (گننے) پر ہے، کیفیت (تولنے) پر نہیں۔ انھوں نے دین اور سیاست کو جدا جدا خانوں میں بانٹ دینے کی مغربی سازش سے قوم کو آگاہ کیا اور بلا خوف لومۃ لائم اس بات کا ببانگ دہل اعلان کیا کہ دین کو سیاست سے نفی کر دیا جائے تو حاصلِ تفریق 'چنگیزی' کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ آپ مسلمانوں کو ان صفات سے متصف دیکھنا چاہتے تھے جن سے انھوں نے اپنی شاعری میں شاهین کو متصف کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے خون کی سفیدی کے شاکی تھے اور چاہتے تھے ایک بار پھر

ان کا لہو سرخ اور گرم ہو؛ لہٰذا آپ نے امت کو 'پلٹنا' اور 'جھپٹنا' کے اسرار و مقاصد سے آگاہ کیا۔ وہ اسلامی تصوف کے مخالف نہیں تھے بلکہ عجمی تصوف کے خلاف تھے جو امت کے شاہین صفت جوانوں کو 'خاکبازی' کا سبق سکھاتا ہے۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کو اپنے تمام جزوی و فروعی اختلافات کو بھلا کر 'اوروں کی عیاری' کو دیکھنے، سمجھنے اور ان کی چالوں کو مات دینے پر آمادہ کیا۔ آپ نے بتایا کہ عالم انسانیت حق کے پیروؤں کا منتظر ہے، کہ وہ اپنی 'نگہ بلند'، 'سخن دلنواز' اور 'جاں پرسوز' کے رختِ سفر کے ساتھ کاروانِ دنیا کی امارت کے فرائض انجام دیں۔

اقبال کی سادگی یہ تھی کہ خدا سے اس کے 'عشق کی انتہا' چاہتے تھے اور دیدہ دلیری کی انتہا یہ تھی اسی خدا کے حضور اپنی شکایت کا ایک طویل و عریض میمورنڈم شکوہ کی صورت میں لکھ کر پیش کر دیا۔ جب اس شکوے اور اس گستاخ شاکی پر کافی ہائے واویلا مچ چکا تو آپ نے خود ہی جوابِ شکوہ میں مسلمانوں کے زوال اور اس کے اسباب کا پورا نقشہ الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا۔ آج کے مسلمانوں میں اور اسلاف میں کیا فرق ہے اس کو روز روشن کی طرح عیاں کیا اور دوبارہ عروج کی منازل کیسے طے کی جاسکتی ہیں اس کا بیان فرمایا۔

اقبال صحیح معنوں میں شاعرِ اسلام تھے، شاعر انقلاب تھے۔ اپنے اشعار سے آپ نے تن تنہا ایک تحریک کا آغاز کر دیا جس کی بنیاد خالص قرآن وسنت پر تھی اور جس کے نشانے پر ہر وہ بیماری تھی جس سے امت کی کمزوری اور انتشار کا خدشہ ہو۔ آپ عمر بھر وطنیت کے بت کے خلاف برسرِ پیکار، فرقہ پرستی کے خلاف ایک ننگی تلوار، اور اتحاد امت کے علمبردار رہے اور اپنی زندگی، 'قفس' کو 'آشیاں' سمجھنے والوں کو، ان کی غلطی کا احساس دلانے میں گزار دی۔

اقبال کے خیالات اور شاعری آج بھی سیکڑوں افراد کے دلوں کی دھڑکن ہے اور اس نے نہ جانے کتنے ہی خوابیدہ اشخاص کو خواب غفلت سے جگا کر حق کی راہوں پر بڑھے جانے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ نہ جانے کتنے ہی پیروان حق کے ہاتھوں میں 'جہاد زندگانی' کے لیے 'مردوں کی شمشیریں' تھما دیں ہیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ علامہ کی روح کو تسکین اور آخرت میں کامیابی وکامرانی نصیب فرمائے اور ملت کے نوجوانوں کو 'ضرب کلیم' سے آشنا کر دے تا کہ غلامی کی ہر زنجیر کو وہ 'ذوق یقیں' کی تلوار سے کاٹ کر رکھ دیں۔ آمین!